HAL open science

GHULAM BAGH: AMBIVALENCE OF A POSTCOLONIAL NOVELIST

Muhammad Naeem

▶ To cite this version:

Muhammad Naeem. GHULAM BAGH: AMBIVALENCE OF A POSTCOLONIAL NOVELIST. Oriental College Magazine, 2024, 99 (2), pp.27-36. hal-04637810

HAL Id: hal-04637810
https://hal.science/hal-04637810

Submitted on 10 Jul 2024

HAL is a multi-disciplinary open access archive for the deposit and dissemination of scientific research documents, whether they are published or not. The documents may come from teaching and research institutions in France or abroad, or from public or private research centers.

L'archive ouverte pluridisciplinaire **HAL**, est destinée au dépôt et à la diffusion de documents scientifiques de niveau recherche, publiés ou non, émanant des établissements d'enseignement et de recherche français ou étrangers, des laboratoires publics ou privés.

Distributed under a Creative Commons Attribution - NonCommercial 4.0 International License

اورینٹل کالج میگزین، جلد۹۹، شمارہ۲، مسلسل شمارہ:۳۷۲، سال۲۰۲۴ء

غلام باغ: پسِ استعماری تخلیق کار کا مخمصہ

محمد نعیم، پی ایچ ڈی

ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو

ادارہ زبان و ادبیاتِ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

GHULAM BAGH
AMBIVALENCE OF A POSTCOLONIAL NOVELIST

Muhammad Naeem, PhD
Associate Professor of Urdu
Institute of Urdu Language and Literature
University of the Punjab, Lahore

Abstract

A novel is at least a new world, or a new understanding of it. Is it possible to present the new world with old words? Or it requires new words. If the existing social structure (ethos) and concept of reality (world view) is to be changed, then mere wording does not work, one has to do experiments of form. Then, in a post-colonial society, it is difficult to bear the burden of history and to mark the form of error implicit in its construction, without a new understanding of history. In Mirza Athar Baig's novel, *Ghulam Bagh*, word-making and formal experiments come out as prominent features. This novel is a dilemma of the characters trying to understand the reality and determine their status in the post-colonial situation. This article using the tools of close reading, explores the formal innovations of *Ghulam Bagh.*

Keywords:

Postcolonial Novel, Nihilism, Structural Changes, Ambivalence, Ghulam Bagh

برعظیم کی تاریخ پر غور کرتے ہوئے، اس تاریخی کلامیے سے اعراض نہیں کیا جا سکتا، جو کئی صدیوں سے نوواردوں کی تحریروں کے ذریعے صورت پذیر ہوا ہے۔ ہندوستانی ذہن غیر تاریخی ہے؟ یہ ایسا خیال ہے جو بقول ونے لال کم از کم البیرونی کے بعد سے عام رہا ہے۔ البیرونی شاکی ہے کہ ہندوؤں کا ذہن واقعات کی زمانی ترتیب سے زیادہ شناسا نہیں۔ گبن کا دعویٰ ہے کہ ایشیاوالے تاریخ کے فن اور جینیئس سے ناواقف ہیں۔ رابرٹ پرسی وال کا کہنا ہے کہ پرتگیزیوں کی آمد سے پہلے (سولھویں صدی) سر لنکن لوگوں کے ہاں جنگلی کہانیاں ملتی ہیں جو جزیرے کی قدیم تاریخ پر کوئی روشنی نہیں ڈالتیں۔ یہاں ایک دل چسپ حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ برطانوی مورخین جو زیادہ تر ہندوستان میں منتظمین بھی تھے، ان کے نزدیک مسلمانوں کی آمد کے بعد ہی برصغیر میں تاریخی تحریروں کا سراغ ملنا شروع ہوتا ہے۔ اس عمومی تصور کے باوصف ایچ ایم ایلیٹ مسلم تاریخوں کو سال ناموں(Annals) سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا، جو "واقعات کا خشک بیان" ہیں۔ اس ساری بحث سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ استعماریوں کے زمانے تک ہندوستانیوں کی بڑی تعداد کو تاریخی شعور سے عاری تصور کیا جاتا تھا۔(۱)

غلام باغ میں استعماری علم اور مقامی معلومات کی باہمی تشکیلی عملیدگی(process) کو بیان کیا گیا ہے۔ ایسے علم میں سوالات اس ذہنی سانچے کے تخلیق کردہ ہوتے ہیں جو ایمپائر کی ثقافتی برتری کے زمانے میں پرورش پاتا ہے۔ استعمار کار دنیا کے بارے عمومی تجسس کی بجائے ایمپائری افادہ طلب ذہن سے معاملہ کرتا ہے۔(۲) اسے ایمپائر کے غیر باشندوں سے اپنے مفید مطلب معلومات کی طلب ہوتی ہے۔ اس ساری عملیدگی میں توجہ طلب مظہر استعماری سوال اور مستعمری معلومات کے درمیان پایا جانے والا افتراق ہے۔ یہ دل چسپ صورتحال ہے، جسے سائنسی کہنے میں بہر حال تامل ہے۔(۳) کسی مقامی علم کی دریافت جب ایمپائری سوالات کے آلات سے ہوتی ہے تو بہت سے آثار کو کھنڈر اور من چاہے کھنڈروں کو آثار قرار دیا جاتا ہے۔ ارزل نسلوں کی اساطیر کے کھوجی والٹن کے تمام سوالات، طریقہ کار اور نتائج کی جستجو ایمپائری استعمار کاروں سے وضع کیے گئے ہیں:

> "ارزل نسل کی نشاندھی کرانے کے بعد میں اپنی مترجمین کی ٹیم کے ساتھ ان کے افراد سے ملاقات کرتا تھا اور اپنے عالم دوستوں کی لسانی-تاریخی-انتھرو پولا جیکل اور فزیولا جیکل نظریوں کا ان کے جسموں، ان کی باتوں اور ان کی حرکتوں پر اطلاق کرتا تھا۔"(۴)

غلام باغ میں یاور عطائی کے خاندانی پس منظر کو واضح کرنے کے لیے نوآبادیاتی دور کی سماجی تاریخ کو پیش کیا گیا ہے۔ اس عہد کے ارد گرد کھیلے گئے ڈرامے کا باب استعماری علمی وضعوں کی پیش کش رکھتا ہے اور اس میں سماجی طور پہ حاکم و محکوم کی ازلی اساطیر سے سروکار رکھا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ارزل نسل استعماری دور سے پہلے غیر تاریخی ماضی کی حامل ہے، جس کی قسمت میں وضعی تبدیلیاں(structural changes) برطانوی دور کے تعمیر کردہ معاشی اور سماجی ڈھانچے سے آنا شروع ہوئیں۔ اس دور کی پیش کش میں پگل اور مانگر جاتی کے علاوہ تیسرا فریق دکھائی نہیں دیتا کہ ناول کے بیانیے میں سماجی پس منظر کی وضاحت کے لیے انھی دو کو استعمال کیا گیا ہے۔ حاکم و محکوم / ظالم و مظلوم کی یہ ثنوی پیش کش اس عمومی استعماری علم سے ایک حد تک متاثر ہو سکتی ہے جس کے مطابق استعمار سے قبل کا برعظیم غیر تاریخی سماجی انجماد کا شکار تھا جہاں دو قوتیں کار فرما تھیں، اور ایسا صدیوں سے تھا۔ ہو سکتا ہے دوسری کو قوت کہنا عجیب محسوس ہو، لیکن محکوم، مظلوم یا مغلوب انسان بھی اختیار(agency) کا حامل ہوتا ہے، اس لیے اس کے اپنے دائرے میں اختیار کے سبب اسے سماجی علوم میں قوت تسلیم کیا جائے گا۔

۴۹

غلام باغ کے دوسرے باب میں مانگر جاتی کے عام محکومی ڈگر سے منحرف اور باغی افراد کی مثالوں سے شاید یہ دکھایا گیا ہے کہ محکوم بھی اپنے اندر اختیار(agency) رکھتا ہے اور بھلے عمومی سماجی ڈھانچہ غیر متبدل ہو، تبدیلی کی غیر معمولی انفرادی مثالیں مل جانا بعید از قیاس نہیں ہوتا۔ یہاں عمومی چلن کے برعکس کچھ لوگ ایسے ہیں جو سماجی فیبرک پر اپنے دیے گئے رول سے بلند ہونے کا بوتا رکھتے ہیں۔ ان کی مثالوں اور تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا تعلق بڑی حد تک انیسویں صدی سے ہے۔ (ناول کا بیانیہ بنیادی طور پہ بیسویں صدی کے آخری نصف سے متعلق ہے۔) صرف ایک صدی سے تعلق رکھنے والے مختلف کرداروں کی مثالوں کے بعد یہ جملہ لکھا گیا ہے: "یوں خادم حسین کی نسل کا گراف صدیوں میں بس انھی مقامات پر کچھ اوپر اچھلا تھا۔" (۵) یہ نتیجہ تین کرداروں کی مثالوں کے بعد اخذ کیا گیا ہے، جن میں 'حاکو کانٹے والا'، 'ماسٹر کرم الٰہی' اور 'پیراں دتا' (جو تین جماعتیں پڑھا ہوا تھا) شامل ہیں۔ حاکو کی مثال سب سے پہلے دی گئی ہے۔ وہ ریلوے میں ملازم ہے۔ پنجاب میں ریلوے لائن انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں (۱۸۶۰ کے بعد) بچھنا شروع ہوئی۔(۶) اس سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ باقی دونوں باغی کردار حاکو کے بعد سامنے آئے ہیں، اس لیے ان کا تعلق اسی یا بعد کے زمانے سے ہوگا۔ اگر یہ قیاس غیر مدلل محسوس ہو تو دیکھ

لیجیے کرم الٰہی کی ماسٹری اور پیراں دتا کی تین جماعتیں استعماری تعلیمی نظام کی خبر دیتی ہیں۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ تینوں کرداروں کا تعلق ماضی قریب سے ہے اور یقینی طور پہ وہ استعماری دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان تینوں کا انحراف اور بغاوت دکھا رہا ہے کہ نو آبادیاتی دور میں مانگر جاتی کے پاس رفتہ رفتہ متبادل راستے سامنے آ رہے تھے جن میں وہ اپنے ساکت اور طے شدہ رول سے آگے بڑھ سکتے تھے۔ ان تینوں کی بغاوت میں سرکاری مشینری کا حصہ بننے کا پہلو غالب ہے۔ یہ بات غور طلب ہے کہ ناول میں ان کرداروں کے یوں اچانک اپنی نسلی گراف سے بلند ہونے کو سرکاری ملازمت سے منسلک کیا گیا ہے۔ یعنی ناولانہ منطق ہمیں سمجھا رہی ہے کہ واضح سماجی تبدیلی پیداواری ذرائع اور ان کے تعلقات کی تبدیلی کے بعد ہی ممکن ہوئی ہے۔

ناول میں دوسری بڑی تبدیلی یاور کے ہاتھ لگنے والی کتاب سے رونما ہوتی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم از کم ناول میں پیش کیے گئے سماج میں تبدیلی کا ایک ذریعہ "گیدڑ سنگھی" ہے جو اچانک ہاتھ لگنے والے 'خزانے' کی صورت میں ہو سکتی ہے۔ جس کے لیے کسی تاریخی عمل، ذاتی یا اجتماعی کاوش کی ضرورت نہیں ہے۔ یاور کے پس منظر کو ابھارنے کے لیے جن تین کرداروں کو استعمال کیا گیا ہے، ان کی تبدیلی اپنی ذات تک محدود رہی ہے۔ یاور کا باپ انھی کی طرح سرکاری ملازم اور باغی فطرت ہے۔ لیکن اس کے ہاتھ گیدڑ سنگھی لگ گئی ہے جو اسے اپنے پیش رو باغیوں سے مختلف بناتی ہے۔ اس کی تبدیلی اس حد تک ہے کہ اس نے مانگر بستی کی جھونپڑی چھوڑ کر انعام گڑھ کو اپنا مسکن بنایا۔ دیہی سماج میں اپنے مخصوص محلے یا 'گراں' میں مختص کیے گئے علاقے کو چھوڑ کر 'مرکز' میں آ جانا سماجی تبدیلی کی ایک اہم پیش رفت ہے۔ دوسری طرف کتاب اس کے ہاتھ لگی تھی لیکن وہ اسے سوائے محفوظ رکھنے کے اور کچھ نہ کر سکا۔ یاور ایسا کردار ہے جو ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہے۔ اس کے باپ کا بستر مرگ پہ اعترافِ شکست اور یاور کا ردِ عمل اسے والد سے مختلف بناتا ہے۔ باپ، بچوں کی زندگی بدلنے کی تاحیات کوشش کے بعد شکست تسلیم کر رہا ہے جبکہ اسی واقعے کے دوران میں یاور اپنے لیے ایک نئی زندگی کی راہ نکال رہا ہے۔ اس میں حاکم دین کی ہٹ دھرمی اور ماسٹر کرم الٰہی کی اکڑفوں جمع ہو گئی ہیں۔ وہ باپ کی محفوظ کردہ کتاب سے اپنی نسل کی تقدیر بدلنے کے امکان کو حقیقت میں تبدیل کرتا ہے۔ باپ اور یاور کے کتاب کے حوالے سے مختلف راہیں نکالنے سے واضح ہوتا ہے کہ محض گیدڑ سنگھی ہاتھ لگنا کافی نہیں، اس سے کام بھی وہی لے سکتا ہے جو گُنی ہو۔ ناول کے علمی پس منظر کے باوصف ــــ جس میں راوی کے ذریعے عمومی سماجی حقائق، سیاسی صورتِ احوال

اور انسانی ذہن و عمل کی علمی تعبیریں کی گئی ہیں—باغیانہ روش کو تاریخی حقیقت کے طور پہ پیش کیا گیا ہے، ایک سطح پر یہ اچانک اور ناسمجھ میں آنے والا انحراف ہے جس کی کوئی منطقی توجیہ فوری طور پہ نہیں ملتی، لیکن اگر یاور کی نسل کے تین باغی کرداروں کو نظر میں رکھیں تو وہ اسی بغاوت کے لیے ناولانہ منطق فراہم کرنے کے کام آئے ہیں۔

ناول کے مرکزی کردار کبیر کے ہاں ناآسودگی کا احساس غالب ہے۔ یہ احساس اس کے جنسی تجربات اور تحریری تخلیقات دونوں پہ چھایا ہوا ہے۔ وہ کوئی تحریر مکمل نہیں کر پاتا۔ اس کے منزّل نہ ہو پانے کی ناداری کو تشبیہ بھی جنسی دی گئی ہے۔ دوسری طرف ننگا افلاطون ہے جو نوے برس کی عمر میں بھی منزّل ہوتا ہے۔ کبیر بار بار ننگے افلاطون کو قتل کرنے کی خواہش محسوس کرتا ہے۔ وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا ہے۔ یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ اس کے علاوہ کہیں بھی کبیر کسی شخص کے حوالے سے ایسے جذبات نہیں رکھتا۔ حتیٰ کہ اُس کو قتل کرنے کی کوشش میں مصروف امبر جان کے لیے بھی اُس کے ایسے جذبات کی خبر نہیں ملتی۔ ہمارے خیال میں ننگے افلاطون کو قتل کرنے کی خواہش دو حوالوں سے اہم ہے۔ ایک سفید مرد اور دوسرے جنسی تکمیل۔ اگر ناول کے ابتدائی حصے میں موجود مغربی (عموماً) اور استعماری (خصوصاً) عناصر کی طرف راوی کے پوسٹ کولونیل منہج پر نظر ڈالی جائے تو کبیر کے ننگے افلاطون کے خلاف جذبات کی تفہیم کا ایک دروازہ کھلتا ہے۔ دوسری طرف ناآسودہ نوجوان کبیر کے سامنے ایک ضعیف گورا بھی (گوری نسل کا اور جسے افلاطون کہہ کر واضح مغربی انسلاک دیا گیا ہے) آزادہ روی سے جنسی تکمیل کی منزل حاصل کر رہا ہے۔ یہ دونوں حوالے کبیر کو پریشان کرنے کے لیے کافی ہیں۔ کبیر کے مزاج میں استہزا اور تحقیر کا مادہ زیادہ ہے۔ وہ انھی آلات کی مدد سے بڑے سے بڑے فلسفیانہ مباحث اور مقابل موجود شخص کو منہدم کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ننگے افلاطون کے علاوہ کسی کو قتل کرنے کی خواہش اس کے دل میں جنم نہیں لیتی۔

ننگے افلاطون کے مقامی زبان میں "مغلظات" اور "قدیم یونانی منھ" کو متوازی رکھا گیا ہے۔ حقیقت کے ساتھ کھیل کی تعبیری چھیڑ چھاڑ کی جائے تو اس متوازیت کو مقامی زبان سے تعصب بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور اس کے بالکل برعکس یونانی منھ سے نفرت بھی۔ اس متضاد تعبیر پہ حیران نہ ہوں، یاد رہنا چاہیے کہ مغربی دانش مندوں کے ساتھ کبیر کا تعلق محبت-نفرت (love-hate) کا ہے۔ چٹا سائیں (ننگا افلاطون) اپنے چہرے کے نقوش میں "اول و آخر کی لذت" رکھتا ہے (ص ۱۷۷)۔ قتل کی خواہش دل میں

اچانک ابھر آنے سے پہلے کبیر، ننگے افلاطون کو غور سے دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس مشاہدے کے دوران میں اس کے خیالات کو ناول نگار نے یوں بیان کیا: "وہ اتنا عظیم، قوی ہیکل اور ہر جانب پھیلا ہوا تھا کہ ایک ہی نظر، ایک ہی خیال کی گرفت میں نہ آ سکتا تھا۔ (ص ۱۷۶) ناول کے کرداروں پہ نظر رکھیں تو اس خواہشِ قتل کی ایک اور توجیہ کی جا سکتی ہے۔ اپنی آمد تک ننگا افلاطون ناول کا وہ واحد کردار ہے جس کے ہاں کبیر کے لیے کوئی توصیف، تعریف یا آدر نہیں ہے۔ باقی تمام کردار، جرمن ہاف مین، ڈاکٹر ناصر، زہرہ یا مدیر سبھی کبیر کے معترف ہیں اور اس سے دبتے ہیں۔ ننگے افلاطون کے سامنے کبیر خود کو بونا محسوس کر رہا ہے۔ یہ واحد کردار ہے جس کے حضور کبیر تضحیک اور حقارت محسوس کرتا ہے۔ وہ اچانک درآنے والے قتل کے خیال کو بار بار جھٹلاتا ہے اور بعض اوقات اس خیال کے نفسیاتی سبب کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

کبیر کا لفظی مفہوم بڑا ہے۔ اس کا رشتہ کبیر داس سے قائم کیا جا سکتا تھا، تاہم ناول میں ایسا کوئی داخلی اشارہ موجود نہیں۔ اس کے نام کا دوسرا حصہ مہدی بھی عقیدے کی سطح پہ مختلف روایات کا حامل ہے جنھیں خاطر نشین رہنا چاہیے۔ دیکھنا چاہیے کہ کبیر اپنے اردگرد پھیلی زندگی، تصورات اور افراد کے فلسفیانہ انہدام کے علاوہ اور کیا کرتا ہے۔ اور اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ وہ چٹے سائیں سے جڑی دیہاتی روایات کا مذاق اڑاتا ہے۔ وہ وقت کے متعلق فلسفیانہ نظریات تشکیل دیتا ہے اور پھر خود ہی انھیں رد کر دیتا ہے۔ یعنی علمی دنیا ہو یا اعتقاد کی کائنات وہ دونوں کو منہدم کرنے کی کوشش کرتا ہے، سوال یہ ہے کہ آخر اس کا حاصل حصول کیا ہے۔ اس کے ہاں قرار کی کمی ہے، کوئی جائے اماں نہیں ہے۔ یہی بے قراری اسے موت تک لے جاتی ہے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ وہ مادی ضرورتوں سے مجبور ہارا ہوا شخص نہیں ہے، اس کی ناآسودگی فن کارانہ ہے، جو زندگی کے تضادات کو کسی نئے نقطے میں حل کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ اسی لیے توجہ اس کی ناکامی سے زیادہ کوشش کی طرف جاتی ہے۔

کبیر ایک بڑا تخلیقی کارنامہ انجام دینا چاہتا ہے، جب کہ اس کی علمی تربیت خودکار اور بے ترتیب انداز میں کباڑ پہ ہو رہی ہے۔ وہ جعلی / قلمی نام سے مقبول عام رسائل میں تحریریں شائع کروا رہا ہے، کباڑیے کی دکان میں موجود الم غلم کے انبار کی چھانٹی سے یہ امکان پیدا کیا گیا ہے کہ کبیر کے غور و فکر یا مکالموں میں دنیا کے کسی بھی علم کا رنگ چھلکایا جائے تو اوپرا نہ لگے۔

اس کی شخصیت نوآبادیاتی دباؤ کا شکار ہے، جسے یورپیوں سے کد ہے، حالانکہ اس کا تمام علمی سرمایہ یورپی علمی دنیا کے کباڑ سے اٹا پڑا ہے۔ یہ تضاد اس کی شخصیت کو دل چسپ بناتا ہے، اس پہ غور

کرنے کی ضرورت ہے کہ آگے چل کر وہ یا ناول نگار اس تضاد کو کس طرح حل کرتے ہیں یا کم از کم اس کا شعور ہی کبیر حاصل کر پاتا ہے یا نہیں۔ کیوں کہ دنیا کے تمام علوم کے شناور میں کم از کم اپنے تضادات کی تفہیم تو ہونی ہی چاہیے۔ ویسے بھی کباڑ سے گھر کی عارضی تزئین تو ہو سکتی ہے، نیا مکان تعمیر کرنا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کوئی بڑا تخلیقی کارنامہ انجام نہیں دے پاتا۔ کیوں کہ کباڑ کی کثرت سے نیلے رجسٹر کے صفحات تو بھرے جاسکتے ہیں، کوئی منظم تخلیقی تجربہ مشکل ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس کا یہی مخمصہ ناول کی ہیئت سے کھیل کو جنم دیتا ہے۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ اس ناول کے زمانی پھیلاؤ میں کیا صرف نو آبادیاتی دور کو پیش کیا گیا ہے؟ یہاں عموماً ماضی کے دیگر ادوار کا ذکر نہیں ملتا۔ جبکہ نو آبادیاتی دور کو کرداروں اور اداروں / افراد کی تشکیل میں اہم عنصر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یاور عطائی کا خاندانی پس منظر بھی اسی زمانے سے بیانیے کا حصہ بنتا ہے۔ دوسری طرف ارزل نسلوں کی اساطیر کا بیان بھی نو آبادکاری علم کی ہی صورت سامنے آیا ہے۔ تیسرے کبیر کو 'چھانٹی' کے دوران ملنے والی اہم کتاب 'ہند میں ایک مشنری کے اعترافات' کا تعلق بھی اسی زمانے سے ہے۔ جو انیسویں صدی کے نصف اول میں ٹھگوں اور انگریزوں کے تعلقات کا بیان ہے۔ اس کتاب کی طرف اشارہ کر کے اس موضوع پر لکھنے والے اہم یورپی مصنفین کی اسم شماری کی گئی ہے اور اس کے بعد ٹھگی کے اہم ہندوستانی کرداروں کے نام اور کسی حد تک ان کی زندگی سے منتخب واقعات بھی بیانیے کا حصہ بنائے گئے ہیں۔ یہ سب تفصیلات 'نیلے رجسٹر کے مندرجات ۲ ' والے باب میں آئی ہیں، جہاں کبیر کی ذہنی، عملی، لسانی اور قراتی عملیوں کا بظاہر بے ترتیب جبکہ حقیقتاً شعوری بیان ملتا ہے۔ ان ابواب (نیلے رجسٹر کے مندرجات ۵ باب ہیں) میں شامل مختلف اجزا اور تفاصیل ناول کی عمومی بنت سے بالکل مختلف ہیں۔ یہاں کردار کے بارے انکشافات کے لیے اس کی خود کلامیوں اور خود تحریری اعترافیوں کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ حقیقت اور لسانی حقیقت کے فلسفیانہ مباحث، خیالات کی رو اور انتشار فکری کو مفرد جملوں کے گلدستہ پیراگراف میں پیش کیا گیا ہے۔ یہیں اس مائع نماہیئت میں گنجائش نکالی گئی ہے کہ ٹھگی کے بارے مصنف اپنی معلومات کو ناول کے بیانیے میں شامل کر دے۔ کبیر 'کرائے کے مصنف' اور 'کباڑ کے منتظم' کی تشکیل میں دنیا بھر کے علومی امکانات کو روا رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی متنوع تاہم کبیر کے لحاظ سے Relevant معلومات بیانیے کا حصہ بن جاتی ہیں۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ کبیر کے برسوں پہلے مطالعے سے اخذ کردہ معلومات میں سے ٹھگوں کی ایک واردات کو بغیر کسی تناظر کے پیش کیا گیا ہے۔ پادری کی کتاب سے کبیر کا ذہن اس واردات کی طرف منتقل ہوتا ہے جیسے اس کی ذہنی فلم سے صفحے پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ ٹھگوں کی وارداتِ قتل کے لیے کبیر نے 'ہولناک مطالعے'، 'خونی مناظر' اور 'منکے ٹوٹنے کی

موسیقی' جیسی تراکیب استعمال کر کے پادری کی کتاب سے ایسی توقعات قائم کی ہیں۔ اس کے بعد پادری کی کتاب کے مطالعے کو کبیر کے خلاصے کے ذریعے سامنے لایا گیا ہے۔ جس میں عمومی تفصیلات کے بعد پادری کے لیے اہم ترین سوال یا مخمصہ یہ ہے کے ٹھگی میں ہندو اور مسلمان کی تخصیص نہیں ہے۔ دوسرے ٹھگ، بھوانی کے پجاری ہیں اور اسی سے شگون لیتے ہیں۔ وہ حیران ہوتا ہے کہ ہندو تو بھوانی کو مان سکتے ہیں، مسلمان ٹھگ اس پر "مذہبی عقیدت اور روحانی جوش و خروش سے کیسے ایمان لا سکتا ہے۔" (ص ۴۳۲) وہ اس مخمصے میں ہے کہ پابند صوم و صلوٰۃ مسلمان جے بھوانی کا نعرہ لگا کر بے رحمانہ قتل کیسے کر سکتا ہے۔ وہ کسی ماہرِ عمرانی علوم کی طرح کچھ سوال قائم کرتا ہے۔ ان سوالات میں ٹھگی کی نوعیت، انسانی ضمیر اور مذہب سے اس کا تعلق، ٹھگ مت کے ایک الگ مذہب ہونے کا امکان، مذہبی اختلافات کے معلق نہ رہنے کا امکان، ٹھگوں کی خفیہ شناخت اور کسی عیسائی کے لیے، عیسائی رہتے ہوئے بھوانی کی ہستی میں ادغام جیسے معاملات پر غور کیا گیا ہے۔ یہاں نو آبادیاتی مصنفین / ادب کا ایک اہم پہلو مرزا صاحب کی تحریر میں جھلکتا ہے، جس کی رو سے نو آبادکار جب بھی اپنی پہلے سے سوچی ہوئی سماجی، مذہبی یا علمی وضعوں اور سلطنت (empire) کے مختلف سماجوں کے درمیان عدم مطابقت دیکھتا ہے تو پریشانی میں عموماً اپنے طے شدہ تصورات تبدیل نہیں کرتا بلکہ استعمار زدوں کو تہذیب سے مزید دور اور انسانیت سے محروم تصور کرنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس یہاں پادری خود الجھ کر رہ گیا ہے۔ اس کے استعماری ذہن میں طے ہے کہ افراد کی واضح مذہبی شناختیں ہوتی ہیں۔ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والوں میں اختلافات بالکل بین اور دوٹوک ہوتے ہیں اور کم از کم عقیدے کی سطح پر دو مختلف مذاہب کسی ایک مذہب کے ماننے والا / والی دوسرے مذہب کے ایقانی یا الہایاتی تیقنات کو قبول / تسلیم نہیں کر سکتا۔ ایسا سوچنا نو آبادیاتی غیریت (otherness) کے پروردہ ذہن کا عمومی چلن ہے، جس کے مطابق دنیا میں 'ہم' معیار ہوتے ہیں اور 'دوسرے' اس معیار کی روشنی میں دوست / دشمن، اچھے / برے، صحیح / غلط قرار پاتے ہیں۔ پادری اپنی ذہنی تشکیل کے برعکس صورت حال کا شکار ہوتا ہے تو بتدریج پگلا جاتا ہے۔ مرزا صاحب کا ناول کم از کم یہی دکھا رہا ہے کہ پیچیدہ مقامی / دیسی سماجی، ثقافتی اور انسانی صورت احوال پر نو آبادکار سنجیدگی سے غور کرے تو اپنے روزمرہ نو آبادیاتی لسانی اور ذہنی ارتباط کو قائم نہیں رکھ سکے گا۔

ہاف مین ایک جرمن آرکیالوجسٹ ہے جو مقامی لوگوں سے ذاتی دل چسپی لیتا ہے۔ اسے کبیر اور زہرہ سے محبت ہو گئی ہے۔ وہ کبیر کی نظریہ بازی کو پسند کرتا ہے اور زہرہ سے وصل کی شدت اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ جبکہ زہرہ، کبیر، ہاف مین اور ناصر تینوں کو ایک وجود کے طور پر تصور کرتی ہے اور اس کا

وصل کسی سے بھی مکمل نہیں ہوتا۔ کبیر ایک حد تک اس سے جسمانی تعلق (بوسہ بازی اور معانقہ) قائم کرتا ہے، تاہم ہاف مین اسے صرف اپنی آرزوؤں کی حد تک ہی مل پاتا ہے اور وہ بھی تمنائی تخیل میں۔

ہاف مین کی مقامی لوگوں سے دل چسپی دانشورانہ اور انسانی سطحیں رکھتی ہے۔ یہ خصوصیت ناول میں مذکور دیگر یورپی کرداروں سے اسے ممتاز بناتی ہے۔ مقامیوں سے ذہنی اور جسمانی قربت اسے دیگر یورپیوں کی نظر میں اجنبی بنا دیتی ہے۔ اس کی یونیورسٹی کے رجسٹرار کی طرف سے لکھا گیا خط اس علمی تحدیدی پیراڈائم کی طرف اشارہ کرتا ہے، جس کے مطابق صرف لگے بندھے منہاج اور نظری دائرے ہی کسی تحریر یا کام کو تحقیقی / علمی بنا سکتے ہیں۔ مغربی علم کی اس تحدیدی تنظیم میں کسی ایشیائی طرزِ علم کی کوئی گنجائش نہیں۔ عطائی کی دوائیاں تو سیکرٹری (جرمن) بھی حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن وہ کہتا اسے عطائی ہی ہے۔ ہاف مین کی مقامی علم و انسان سے دل چسپی کے نتیجے میں اس کی تحقیق کچھ غیر مغربی منہاجی عناصر اپنے اندر سموتی ہے، جسے سکہ بند علمی پیراڈائم پر چلنے والے قبول نہیں کرتے۔ مشرق و مغرب کی یہ یکجائی ان کے لیے ناقابل قبول ہے۔ اگرچہ براہ راست اس علمی ادغام پر کوئی علومی بحث ناول کا حصہ نہیں بنی، تاہم ناول کی مجموعی ساخت اس ثنوی منطق (binary logic) کے انہدام پر مقامی سیاسی و سماجی اشرافیہ اور یورپی علمی اشرافیہ کی پریشانی اور عملی مخالفت ضرور سامنے لاتی ہے۔ ہاف مین کے عام انسانوں سے میل جول پر مقامی اشرافیہ ناپسندیدگی کا اظہار کرتی ہے۔ حالانکہ اسی اشرافیہ کا نمائندہ نواب پہلا مقامی کردار ہے، جس سے ہاف مین کی ائیرپورٹ کے باہر ملاقات ہوتی ہے۔ مقامی اشرافیہ یورپیوں سے مرعوبی تعلق قائم کھنا چاہتی ہے، لیکن یورپیوں کا غیر اشرافی کرداروں کے ساتھ برابری کا تعلق انھیں قبول نہیں۔

غلام باغ مقامی اور مغربی اشرافیہ کے سماجی اور علمی کلامیوں کو چنوتی دیتا ہے۔ تاریخ کے عمومی بیانیے ہوں، علوم کے ثقہ منہاج یا سماجی درجہ بندی کے معروف چلن، سبھی کبیر کی انہدامی کاوشوں کی زد پر ہیں۔ جس سے ناول تاریخ و سماج کی تفہیمِ نو اور نئے بیانیے تشکیل دینے میں کامیاب ہوا ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) میری یہ بحث ونے لال کی درج ذیل کتاب سے ماخوذ ہے:

Vinay Lal, The History of History: Politics and Scholarship in Modern India (Oxford: Oxford University Press, 2003)

(۲) استعماری علم کی تشکیل پہ تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے:

Edward Said, *Orientalism* (New York: Pantheon Books, 1978)

(۳) کسی ثقافت کے بارے جاننے کے لیے باہر سے آئے کسی فرد کے پاس سوالات، معلومات کی نوعیت اور مطلوب مواد کا تعین، اس کے مقاصد کے ساتھ ساتھ اس کے اپنے ثقافتی تصورِ دنیا سے طے ہوتے ہیں۔ یہ بحث اپنی جگہ موجود ہے کہ کیا کوئی غیر کسی مقامی ثقافت کو جان سکتا ہے۔ ان مباحث کو زیادہ تقویت اس وقت ملی جب سابقہ ایمپائر اور موجودہ مابعد نوآبادیاتی ممالک کے بارے موجود بشریاتی تحقیقات اور آزادی کے بعد ان ملکوں کی معاصر ثقافتوں پہ کام کرنے والے ماہرین کی تحریروں کا موازنہ شروع ہوا۔ نئے ممالک یا مابعد نوآبادیاتی ممالک پہ کام کرنے والے مختلف مغربی محققین نے بشریاتی تحقیق کے لیے سوالنامے کی تیاری اور محقق کے نقطہ نظر کی محکم حیثیت پر سوال اٹھائے۔ یوں غیر ملکی محقق اور مقامی آدمی کے موقف کے درمیان موجود تناؤ کی نشاندہی ہونے لگی۔ اس دوران میں امریکی ماہرِ بشریات کلفرڈ گیرٹز نے مقامی علمی (Local Knowledge) کا تصور پیش کیا اور محقق کی بجائے مقامی آدمی کے مؤقف کی اہمیت اور مرکزیت پر صاد کیا۔ اس کے تصورات سے شناسائی کے لیے دیکھیے:

Clifferd Geertz, Local Knowledge: Further Essays in Interpretive Anthropology. (New York: Basic Books, 1983)

(۴) مرزا اطہر بیگ، غلام باغ (لاہور: سانجھ پبلشرز، ۲۰۰۶)، ۶۱۔

(۵) ایضاً، ۶۷۔

(6) Singh, Bhupinder. "Colonialism and Transformation in Punjab: A Story of Railway Development." In *The Railways in Colonial South Asia*, pp. 397-412. (New York & London: Routledge, 2021).

BIBLIOGRAPHY

- Mirza Athar Baig, *<u>Gh</u>ulam Ba<u>gh</u>*, (Lahore: Sanjh Publishers, 2006)
- Geertz, Clifferd. *Local Knowledge: Further Essays in Interpretive Anthropology.* (New York: Basic Books, 1983)
- Lal, Vinay. *The History of History: Politics and Scholarship in Modern India.* Oxford: Oxford University Press, 2003.
- Said, Edward. *Orientalism.* New York: Pantheon Books, 1978.
- Singh, Bhupinder. "Colonialism and Transformation in Punjab: A Story of Railway Development." In *The Railways in Colonial South Asia*, pp. 397-412. New York & London: Routledge, 2021.

❖❖❖